تفہیم القرآن

الجاثیہ

(۲)

کیا[۲۶] وہ لوگ جنہوں نے بُرائیوں کا ارتکاب کیا ہے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم انہیں اور ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ایک جیسا کر دیں گے کہ ان کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے؟ بہت بُرے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں[۲۷] ع اللہ نے تو آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے[۲۸] اور ع ۲

---

[۲۶] توحید کی دعوت کے بعد اب یہاں سے آخرت پر کلام شروع ہو رہا ہے۔

[۲۷] یہ آخرت کے برحق ہونے پر اخلاقی استدلال ہے۔ اخلاق میں خیر و شر اور اعمال میں نیکی و بدی کے فرق کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اچھے اور بُرے لوگوں کا انجام یکساں نہ ہو، بلکہ اچھوں کو ان کی اچھائی کا اچھا بدلہ ملے اور بُرے اپنی بُرائی کا بُرا بدلہ پائیں۔ یہ بات اگر نہ ہو، اور نیکی و بدی کا نتیجہ ایک ہی جیسا ہو تو سرے سے اخلاق میں خوبی و زشتی کی تمیز ہی بے معنی ہو جاتی ہے اور خدا پر بے انصافی کا الزام عائد ہوتا ہے۔ جو لوگ دنیا میں بدی کی راہ چلتے ہیں وہ تو ضرور یہ چاہتے ہیں کہ کوئی جزا و سزا نہ ہو، کیونکہ یہ تصور ہی اُن کے عیش کو منغص کر دینے والا ہے۔ لیکن خداوندِ عالم کی حکمت اور اس کے عدل سے یہ بات بالکل بعید ہے کہ وہ نیک و بد سے ایک جیسا معاملہ کرے اور کچھ نہ دیکھے کہ مومنِ صالح نے دنیا میں کس طرح زندگی بسر کی ہے اور کافر و فاسق یہاں کیا گل کھلاتا رہا ہے۔ ایک شخص عمر بھر اپنے اوپر اخلاق کی پابندیاں لگائے رہا۔ حق والوں کے حق ادا کرتا رہا۔ ناجائز فائدوں اور لذتوں سے اپنے آپ کو محروم کیے رہا۔ اور حق و صداقت کی خاطر طرح طرح کے نقصانات برداشت کرتا رہا۔ دوسرے شخص نے اپنی خواہشات ہر ممکن طریقے سے پوری کیں، نہ خدا کا حق پہچانا اور نہ بندوں کے حقوق پر دست درازی

اس لیے کیا ہے کہ ہر متنفس کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے۔ لوگوں پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا۔[۲۹]
پھر کیا تم نے کبھی اُس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا[۳۰]

کرنے سے باز آیا جس طرح سے بھی اپنے لیے فائدے اور لذتیں سمیٹ سکتا تھا سمیٹتا چلا گیا۔ کیا خدا سے یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ ان دونوں قسم کے آدمیوں کی زندگی کے اس فرق کو وہ نظر انداز کر دیگا؟ مرنے دم تک جن کا جینا یکساں نہیں رہا ہے، موت کے بعد اگر ان کا انجام یکساں ہو تو خدا کی خدائی میں اس سے بڑھ کر اور کیا بے انصافی ہو سکتی ہے؟ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم ص ۲۶۳-۲۶۴-۳۶۸-۵۴۱۔ جلد سوم ۲۰۵-۲۰۶-۶۰۰-۷۳۱ تا ۷۳۴۔ جلد چہارم، تفسیر سورۂ ص۔ آیت ۲۸۔ حاشیہ ۳۰)

۲۸؎ یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمان کی تخلیق کھیل کے طور پر نہیں کی ہے بلکہ یہ ایک بامقصد حکیمانہ نظام ہے۔ اِس نظام میں یہ بات بالکل ناقابلِ تصور ہے کہ اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات اور ذرائع و وسائل کو صحیح طریقہ سے استعمال کر کے جن لوگوں نے اچھا کارنامہ انجام دیا ہو، اور انہیں غلط طریقے سے استعمال کر کے جن دوسرے لوگوں نے ظلم و فساد برپا کیا ہو، یہ دونوں قسم کے انسان آخر کار مر کر مٹی ہو جائیں اور اس موت کے بعد کوئی دوسری زندگی نہ ہو جس میں انصاف کے مطابق ان کے اچھے اور بُرے اعمال کا کوئی اچھا یا بُرا نتیجہ نکلے۔ اگر ایسا ہو تو یہ کائنات ایک مکلنڈرے کا کھلونا ہو گی نہ کہ ایک حکیم کا بنایا ہوا بامقصد نظام (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اوّل، ص ۵۵۱۔ جلد دوم، ص ۲۶۴-۲۶۵-۴۷۹-۴۸۰-۵۲۵-۵۲۶۔ جلد سوم، ص ۷۰۳-۷۳۲)۔

۲۹؎ اِس سیاق و سباق میں اِس فقرے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر نیک انسانوں کو ان کی نیکی کا اجر نہ ملے، اور ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا نہ دی جائے، اور مظلوموں کی کبھی دادرسی نہ ہو تو یہ ظلم ہو گا۔ خدا کی خدائی میں ایسا ظلم ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اِسی طرح خدا کے ہاں ظلم کی یہ دوسری صورت بھی کبھی رونما نہیں ہو سکتی کہ کسی نیک انسان کو اس کے استحقاق سے کم اجر دیا جائے، یا کسی بد انسان کو اس کے استحقاق سے زیادہ سزا دے دی جائے۔

اور اللہ نے علم کے باوجود[۳۱] اُسے گمراہی میں پھینک دیا اور اُس کے دل اور کانوں پر مُہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا[۳۲]۔ اللہ کے بعد اب اور کون ہے جو اسے ہدایت

۳۰؎ خواہشِ نفس کو خدا بنا لینے سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی خواہش کا بندہ بن کر رہ جائے۔ جس کام کو اس کا دل چاہے اُسے کر گزرے، خواہ خدا نے اسے حرام کیا ہو، اور جس کام کو اس کا دل نہ چاہے اسے نہ کرے، خواہ خدا نے اسے فرض کر دیا ہو۔ جب آدمی اِس طرح کسی کی اطاعت کرنے لگے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا معبود خدا نہیں ہے بلکہ وہ ہے جس کی وہ اس طرح اطاعت کر رہا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ زبان سے اس کو اپنا الٰہ اور معبود کہتا ہو یا نہ کہتا ہو، اور اس کا بُت بنا کر اس کی پُوجا کرتا ہو یا نہ کرتا ہو۔ اس لیے کہ ایسی بے چون و چرا اطاعت ہی اُس کے معبود بن جانے کے لیے کافی ہے اور اِس عملی شرک کے بعد ایک آدمی صرف اِس بنا پر شرک کے جُرم سے بری نہیں ہو سکتا کہ اس نے اپنے اُس مطاع کو زبان سے معبود نہیں کہا ہے اور سجدہ اس کو نہیں کیا ہے۔ اس آیت کی یہی تشریح دوسرے اکابر مفسرین نے بھی کی ہے۔ ابن جریر اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ "اس نے اپنی خواہشِ نفس کو معبود بنا لیا۔ جس چیز کی نفس نے خواہش کی اس کا ارتکاب کر گزرا۔ نہ اللہ کے حرام کیے ہوئے کو حرام کیا، نہ اس کے حلال کیے ہوئے کو حلال کیا"۔ ابوبکر جصّاص اس کے معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ "وہ خواہشِ نفس کی اس طرح اطاعت کرتا ہے جیسے کوئی خدا کی اطاعت کرے"۔ زمخشری اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ "وہ خواہشِ نفس کا نہایت فرمانبردار ہے۔ جدھر اس کا نفس اسے بلاتا ہے اسی طرف وہ چلا جاتا ہے، گویا کہ وہ اس کی بندگی اس طرح کرتا ہے جیسے کوئی شخص اپنے خدا کی بندگی کرے"۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۴۵۲۔ جلد چہارم، تفسیر سورۂ سبا، حاشیہ ۶۳۔ یٰس، حاشیہ ۵۲۔ الشوریٰ، حاشیہ ۳۸)

۳۱؎ اصل الفاظ ہیں اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ۔ ایک مطلب ان الفاظ کا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ شخص عالم ہونے کے باوجود اللہ کی طرف سے گمراہی میں پھینکا گیا، کیونکہ وہ خواہشِ نفس کا بندہ بن گیا تھا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ نے اپنے اِس علم کی بنا پر کہ وہ اپنے نفس کی خواہش کو اپنا خدا بنا بیٹھا ہے

دے ؟ کیا تم لوگ کوئی سبق نہیں لیتے ؟[۳۳]

اسے گمراہی میں پھینک دیا۔

۳۲؎ اللہ کے کسی کو گمراہی میں پھینک دینے اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دینے اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دینے کی تشریح اس سے پہلے ہم متعدد مقامات پر اس کتاب میں کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، ص ۵۲-۵۵-۵۳۱-۵۳۸۔ جلد دوم، ص ۶۱-۶۲-۲۲۱-۲۲۲-۲۲۴-۳۰۱-۴۵۸-۴۵۹-۴۷۰-۴۷۱-۴۸۶-۵۷۵-۵۷۶-۶۱۹-۶۲۰۔ جلد سوم، ص ۷۶۷۔ جلد چہارم، فاطر، آیت ۸، حواشی ۱۶-۱۷۔ المومن، حاشیہ ۵۴۔

۳۳؎ جس سیاق و سباق میں یہ آیت آئی ہے اُس سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ آخرت کا انکار دراصل وہی لوگ کرتے ہیں جو خواہشاتِ نفس کی بندگی کرنا چاہتے ہیں اور عقیدۂ آخرت کو اپنی اِس آزادی میں مانع سمجھتے ہیں۔ پھر جب وہ آخرت کا انکار کر دیتے ہیں تو اُن کی بندگیٔ نفس اور زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور وہ اپنی گمراہی میں روز بروز زیادہ ہی بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی برائی ایسی نہیں ہوتی جس کے ارتکاب سے وہ باز رہ جائیں۔ کسی کا حق مارنے میں انہیں تأمل نہیں ہوتا۔ کسی ظلم اور زیادتی کا موقع پا جانے کے بعد ان سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس سے صرف اس لیے رُک جائیں گے کہ حق و انصاف کا کوئی احترام ان کے دلوں میں ہے۔ جن واقعات کو دیکھ کر کوئی انسان عبرت حاصل کر سکتا ہے، وہی واقعات اُن کی آنکھوں کے سامنے بھی آتے ہیں، مگر وہ اُن سے اُلٹا یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، ٹھیک کر رہے ہیں اور ہمیں یہی کچھ کرنا چاہیے۔ کوئی کلمۂ نصیحت ان پر کارگر نہیں ہوتا۔ جو دلیل بھی کسی انسان کو بُرائی سے روکنے کے لیے مفید ہو سکتی ہے، وہ ان کے دل کو اپیل نہیں کرتی، بلکہ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ساری دلیلیں اپنی اِسی بے قید آزادی کے حق میں نکالتے چلے جاتے ہیں، اور ان کے دل و دماغ کسی اچھی فکر کے بجائے شب و روز اپنی اغراض و خواہشات ہر ممکن طریقے سے پُوری کرنے کی اُدھیڑ بُن ہی میں لگے رہتے ہیں۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ عقیدۂ آخرت کا انکار انسانی اخلاق کے لیے تباہ کُن ہے۔ آدمی کو آدمیت کے دائرے میں اگر کوئی چیز رکھ

یہ لوگ کہتے ہیں کہ "زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے، یہیں ہمارا مرنا اور جینا ہے، اور گردشِ ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو"۔ درحقیقت اِس معاملہ میں اِن کے پاس کوئی علم نہیں ہے۔ یہ محض گمان کی بنا پر یہ باتیں کرتے ہیں[۳۴]۔ اور جب ہماری واضح آیات انہیں سُنائی جاتی ہیں[۳۵] تو اِن کے پاس کوئی حجّت اس کے سوا نہیں ہوتی کہ اٹھا لاؤ

سکتی ہے تو وہ صرف یہ احساس ہے کہ ہم غیر ذمّہ دار نہیں ہیں بلکہ ہمیں خدا کے حضور اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہوگی۔ اس احساس سے خالی ہو جانے کے بعد کوئی شخص بڑے سے بڑا عالم بھی ہو تو وہ جانوروں سے بدتر رویّہ اختیار کیے بغیر نہیں رہتا۔

۳۴؎ یعنی کوئی ذریعۂ علم ایسا نہیں ہے جس سے ان کو تحقیق یہ معلوم ہو گیا ہو کہ اِس زندگی کے بعد انسان کے لیے کوئی دوسری زندگی نہیں ہے، اور یہ بات بھی انہیں معلوم ہو گئی ہو کہ انسان کی روح کسی خدا کے حکم سے قبض نہیں کی جاتی ہے بلکہ آدمی محض گردشِ ایام سے مر کر فنا ہو جاتا ہے۔ منکرینِ آخرت یہ باتیں کسی علم کی بنا پر نہیں بلکہ محض گمان کی بنا پر کرتے ہیں۔ علمی حیثیت سے اگر وہ بات کریں تو زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ بس یہ ہے کہ "ہم نہیں جانتے کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں"۔ لیکن یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ "ہم جانتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے"۔ اسی طرح علمی طریقہ پر وہ یہ جاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتے کہ آدمی کی روح خدا کے حکم سے نکالی نہیں جاتی ہے بلکہ وہ محض اُس طرح مر کر ختم ہو جاتا ہے جیسے ایک گھڑی چلتے چلتے رک جائے۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ کہہ سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ ہم ان دونوں باتوں میں سے کسی کے متعلق یہ نہیں جانتے کہ فی الواقع کیا صورت پیش آتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب انسانی ذرائعِ علم کی حد تک زندگی بعد موت کے ہونے یا نہ ہونے، اور قبضِ روح واقع ہونے یا گردشِ ایام سے آپ ہی آپ مر جانے کا یکساں احتمال ہے، تو آخر کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ امکانِ آخرت کے احتمال کو چھوڑ کر حتمی طور پر انکارِ آخرت کے حق میں فیصلہ کر ڈالتے ہیں۔ کیا اس کی وجہ اِس کے سوا کچھ اور ہے کہ دراصل اس مسئلے کا آخری فیصلہ وہ دلیل کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی خواہش کی بنا پر کرتے ہیں؟ چونکہ ان کا دل یہ نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہو اور موت کی

ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو۔[۳۶] اے نبی، ان سے کہو اللہ ہی تمہیں زندگی بخشتا ہے پھر وہی تمہیں موت دیتا ہے،[۳۷] پھر وہی تم کو اُس قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں،[۳۸] مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں[۳۹] ع۔ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اللہ ہی ع۳

حقیقت نیستی اور عدم نہیں بلکہ خدا کی طرف سے قبضِ روح ہو، اس لیے وہ اپنے دل کی مانگ کو اپنا عقیدہ بنا لیتے ہیں اور دوسری بات کا انکار کر دیتے ہیں۔

۳۵؎ یعنی وہ آیات جن میں آخرت کے امکان پر مضبوط عقلی دلائل دیئے گئے ہیں، اور جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ اُس کا ہونا عین حکمت و انصاف کا تقاضا ہے اور اُس کے نہ ہونے سے یہ سارا نظامِ عالم بے معنی ہو جاتا ہے۔

۳۶؎ دوسرے الفاظ میں اُن کی اس حجت کا مطلب یہ تھا کہ جب کوئی اُن سے یہ کہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ہو گی تو اُسے لازماً قبر سے ایک مُردہ اٹھا کر اُن کے سامنے لے آنا چاہیے۔ اور اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو وہ یہ نہیں مان سکتے کہ مرے ہوئے انسان کسی وقت از سرِ نو زندہ کر کے اٹھائے جانے والے ہیں۔ حالانکہ یہ بات سرے سے کسی نے بھی ان سے نہیں کہی تھی کہ اس دنیا میں متفرق طور پر وقتاً فوقتاً مُردوں کو دوبارہ زندہ کیا جاتا رہے گا۔ بلکہ جو کچھ کہا گیا تھا وہ یہ تھا کہ قیامت کے بعد اللہ تعالیٰ بیک وقت تمام انسانوں کو از سرِ نو زندہ کرے گا اور ان سب کے اعمال کا محاسبہ کر کے جزا اور سزا کا فیصلہ فرمائے گا۔

۳۷؎ یہ جواب ہے اُن کی اِس بات کا کہ موت گردشِ ایام سے آپ ہی آ جاتی ہے۔ اِس پر فرمایا جا رہا ہے کہ نہ تمہیں زندگی اتفاقاً ملتی ہے، نہ تمہاری موت خود بخود واقع ہو جاتی ہے۔ ایک خدا ہے جو تمہیں زندگی دیتا ہے اور وہی اسے سلب کرتا ہے۔

۳۸؎ یہ جواب ہے ان کی اس بات کا کہ اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ یہ اب نہیں ہو گا، اور متفرق طور پر نہیں ہو گا، بلکہ ایک دن سب انسانوں کے جمع کرنے کے لیے مقرر ہے۔

۳۹؎ یعنی جہالت اور قصورِ فکر و نظر ہی لوگوں کے انکارِ آخرت کا اصل سبب ہے، ورنہ

کی ہے[۴۰]، اور جس روز قیامت کی گھڑی آکھڑی ہوگی اُس دن باطل پرست خسارے میں پڑ جائیں گے۔

اُس وقت تم ہر گروہ کو گھٹنوں کے بل گرا دیکھو گے[۴۱]۔ ہر گروہ کو پکارا جائے گا کہ آئے اور اپنا نامۂ اعمال دیکھے۔ اُن سے کہا جائے گا: "آج تم لوگوں کو اُن اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کرتے رہے تھے۔ یہ ہمارا تیار کرایا ہوا اعمال نامہ ہے جو تمہارے اوپر ٹھیک ٹھیک شہادت دے رہا ہے، جو کچھ بھی تم کرتے تھے اسے ہم لکھواتے جا رہے تھے[۴۲]۔" پھر جو لوگ ایمان لائے تھے اور نیک عمل کرتے رہے تھے انہیں ان کا رب اپنی رحمت میں داخل

حقیقت میں تو آخرت کا ہونا نہیں بلکہ اس کا نہ ہونا بعید از عقل ہے۔ کائنات کے نظام اور خود اپنے وجود پر کوئی شخص صحیح طریقہ سے غور کرے تو اسے خود محسوس ہو جائے گا کہ آخرت کے آنے میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔

۴۰؎ سیاق و سباق کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو اِس فقرے سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ جو خدا اس عظیم الشان کائنات پر فرمانروائی کر رہا ہے اس کی قدرت سے یہ بات ہرگز بعید نہیں ہے کہ جن انسانوں کو وہ پہلے پیدا کر چکا ہے انہیں دوبارہ وجود میں لے آئے۔

۴۱؎ یعنی وہاں میدانِ حشر کا ایسا ہَول اور عدالتِ الٰہی کا ایسا رعب طاری ہوگا کہ بڑے بڑے ہیکڑ لوگوں کی اکڑ بھی ختم ہو جائے گی اور عاجزی کے ساتھ سب گھٹنوں کے بل گرے ہونگے۔

۴۲؎ لکھوانے کی صرف یہی ایک ممکن صورت نہیں ہے کہ کاغذ پر قلم سے لکھوایا جائے۔ انسانی اقوال و افعال کو ثبت کرنے اور دوبارہ اُن کو بعینہٖ اُسی شکل میں پیش کر دینے کی متعدد دوسری صورتیں اِسی دنیا میں خود انسان دریافت کر چکا ہے، اور ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ آگے اِس کے اور کیا امکانات پوشیدہ ہیں جو کبھی انسان ہی کی گرفت میں آجائیں گے۔ اب یہ کون جان سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کس کس طرح انسان کی ایک ایک بات، اور اس کی حرکات و سکنات میں سے ایک ایک چیز، اور اس کی نیتوں اور ارادوں اور خواہشات اور خیالات میں سے ہر مخفی سے مخفی شے کو

کرے گا اور یہی صریح کامیابی ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا تھا اُن سے کہا جائے گا "کیا میری آیات تم کو نہیں سنائی جاتی تھیں؟ مگر تم نے تکبر کیا[۴۳] اور مجرم بن کر رہے۔ اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے، قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں، تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہوتی ہے، ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں، یقین ہم کو نہیں ہے"[۴۴] اُس وقت اُن پر ان کے اعمال کی بُرائیاں کھل جائیں گی اور وہ اُسی چیز کے پھیر میں آجائیں گے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اور ان سے کہہ دیا جائے گا کہ "آج ہم بھی اُسی طرح تمہیں بھلائے دیتے ہیں جس طرح تم اِس دن کی ملاقات کو بھول گئے تھے۔ تمہارا ٹھکانا اب دوزخ

ثبت کرا رہا ہے، اور کس طرح وہ ہر آدمی، ہر گروہ، اور ہر قوم کا پورا کارنامۂ حیات بے کم و کاست اُس کے سامنے لا رکھے گا۔

۴۳؎ یعنی اپنے گھمنڈ میں تم نے یہ سمجھا کہ اللہ کی آیات کو مان کر مطیع فرمان بن جانا تمہاری شان سے فروتر ہے، اور تمہارا مقام بندگی کے مقام سے بہت اونچا ہے۔

۴۴؎ اس سے پہلے آیت ۲۴ میں جن لوگوں کا ذکر گزر چکا ہے وہ آخرت کا قطعی اور کھلا انکار کرنے والے تھے۔ اور یہاں اُن لوگوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اس کا یقین نہیں رکھتے اگرچہ گمان کی حد تک اس کے امکان سے منکر نہیں ہیں۔ بظاہر ان دونوں گروہوں میں اس لحاظ سے بڑا فرق ہے کہ ایک بالکل منکر ہے اور دوسرا اس کے ممکن ہونے کا گمان رکھتا ہے۔ لیکن نتیجے اور انجام کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے کہ آخرت کے انکار، اور اس پر یقین نہ ہونے کے اخلاقی نتائج بالکل ایک جیسے ہیں۔ کوئی شخص خواہ آخرت کو نہ مانتا ہو، یا اس کا یقین نہ رکھتا ہو، دونوں صورتوں میں لازماً وہ خدا کے سامنے اپنی جواب دہی کے احساس سے خالی ہوگا، اور یہ عدمِ احساس اس کو لازماً فکر و عمل کی گمراہیوں میں مبتلا کر کے رہیگا۔ صرف آخرت کا یقین ہی دنیا میں آدمی کے رویّے کو درست رکھ سکتا ہے۔ یہ اگر نہ ہو تو شک اور انکار، دونوں اُسے ایک ہی طرح کی غیر ذمہ دارانہ روش پر ڈال دیتے ہیں۔ اور چونکہ یہی غیر ذمہ دارانہ روش آخرت کی

ہے اور کوئی تمہاری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ یہ تمہارا انجام اس لیے ہوا ہے کہ تم نے اللہ کی آیات کا مذاق بنا لیا تھا اور تمہیں دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا تھا۔ لہٰذا آج نہ یہ لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ان سے کہا جائے گا کہ معافی مانگ کر اپنے رب کو راضی کرو۔[۴۶]

پس تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو زمین اور آسمانوں کا مالک اور سارے جہان والوں کا پروردگار ہے۔ زمین اور آسمانوں میں بڑائی اُسی کے لیے ہے اور وہی زبردست اور دانا ہے ع

بدانجامی کا اصل سبب ہے، اس لیے دوزخ میں جانے سے انکار کرنے والا بچ سکتا ہے، نہ یقین نہ رکھنے والا۔

۴۵؎ یعنی وہاں ان کو پتہ چل جائے گا کہ اپنے جن طور طریقوں اور عادات و خصائل اور اعمال و مشاغل کو وہ دنیا میں بہت خوب سمجھتے تھے وہ سب ناخوب تھے۔ اپنے آپ کو غیر جوابدہ فرض کر کے انہوں نے ایسی بنیادی غلطی کر ڈالی جس کی وجہ سے ان کا پورا کارنامۂ حیات ہی غلط ہو کر رہ گیا۔

۴۶؎ یہ آخری فقرہ اس انداز میں ہے جیسے کوئی آقا اپنے کچھ خادموں کو ڈانٹنے کے بعد دوسروں سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ اچھا، اب ان نالائقوں کی یہ سزا ہے۔

تفہیم القرآن

الاحقاف

نام | آیت نمبر ۲۱ کے فقرے اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول | ایک تاریخی واقعہ سے متعین ہو جاتا ہے جس کا ذکر آیات ۲۹-۳۲ میں آیا ہے۔ ان آیات میں جنوں کے آنے اور قرآن سن کر واپس جانے کا جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ حدیث و سیرت کی متفق علیہ روایات کی رُو سے اُس وقت پیش آیا تھا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے مکۂ معظمہ کی طرف پلٹتے ہوئے نخلہ کے مقام پر ٹھیرے تھے، اور تمام معتبر تاریخی روایات کے مطابق آپ کے طائف تشریف لے جانے کا واقعہ ہجرت سے تین سال پہلے کا ہے، لہٰذا یہ متعین ہو جاتا ہے کہ یہ سورۃ ۱۰ نبوی کے آخر یا ۱۱ نبوی کے ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی۔

تاریخی پس منظر | ۱۰ نبوی حضور کی حیاتِ طیبہ میں انتہائی سختی کا سال تھا۔ تین برس سے قریش کے تمام قبیلوں نے مل کر بنی ہاشم اور مسلمانوں کا مکمل مقاطعہ کر رکھا تھا اور حضور اپنے خاندان اور اپنے اصحاب کے ساتھ شِعبِ ابی طالب[1] میں محصور

---

[1] شعبِ ابی طالب مکۂ معظمہ کے ایک محلّے کا نام تھا جس میں بنی ہاشم رہا کرتے تھے۔ شِعب عربی زبان میں گھاٹی کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ محلّہ کوہ ابوقُبَیس کی گھاٹیوں میں سے ایک گھاٹی میں واقع تھا، اور ابوطالب بنی ہاشم کے سردار تھے، اس لیے اسے شعبِ ابی طالب کہا جاتا تھا۔ مکۂ معظمہ میں جو مکان آج مقامی روایات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامِ پیدائش کی حیثیت سے معروف ہے، اسی کے قریب یہ گھاٹی واقع تھی۔

تھے۔ قریش کے لوگوں نے ہر طرف سے اِس محلّے کی ناکہ بندی کر رکھی تھی جس سے گزر کر کسی قسم کی رسد اندر نہ پہنچ سکتی تھی۔ صرف حج کے زمانے میں یہ محصورین نکل کر کچھ خرید ای کر سکتے تھے، مگر ابولہب جب بھی ان میں سے کسی کو بازار کی طرف، یا کسی تجارتی قافلے کی طرف جاتے دیکھتا، پکار کر تاجروں سے کہہ دیتا کہ جو چیز یہ خریدنا چاہیں اس کی قیمت اتنی زیادہ بتاؤ کہ یہ نہ خرید سکیں، پھر وہ چیز میں تم سے خرید لونگا اور تمہارا نقصان نہ ہونے دوں گا۔ متواتر تین سال کے اس مقاطعہ نے مسلمانوں اور بنی ہاشم کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی اور ان پر ایسے ایسے سخت وقت گزر گئے تھے جن میں بسا اوقات گھاس اور پتے کھانے کی نوبت آجاتی تھی۔

خدا خدا کر کے یہ محاصرہ اِس سال ٹوٹا ہی تھا کہ حضورؐ کے چچا ابوطالب، جو دس سال سے آپ کے لیے ڈھال بنے ہوئے تھے، وفات پا گئے، اور اس سانحے پر بمشکل ایک مہینہ گزرا تھا کہ آپؐ کی رفیقۂ حیات، حضرت خدیجہ بھی انتقال فرما گئیں جن کی ذات آغازِ نبوت سے لے کر اس وقت تک آپ کے لیے وجہِ سکون و تسلی بنی رہی تھی۔ اِن پے در پے صدموں اور تکلیفوں کی وجہ سے حضورؐ اِس سال کو عام الحزن (رنج و غم کا سال) فرمایا کرتے تھے۔

حضرت خدیجہ اور ابوطالب کی وفات کے بعد کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اور زیادہ دلیر ہو گئے۔ پہلے سے زیادہ آپ کو تنگ کرنے لگے۔ حتیٰ کہ آپ کا گھر سے باہر نکلنا بھی مشکل ہو گیا۔ اسی زمانہ کا یہ واقعہ ابن ہشام نے بیان کیا ہے کہ ایک روز قریش کے اوباشوں میں سے ایک شخص نے سرِ بازار آپ کے سر پر مٹی پھینک دی۔

آخر کار آپ اس ارادے سے طائف تشریف لے گئے کہ بنی ثقیف کو اسلام کی طرف دعوت دیں اور اگر وہ اسلام نہ قبول کریں تو انہیں کم از کم اس بات پر آمادہ

کریں کہ وہ آپ کو اپنے ہاں چین سے بیٹھ کر کام کرنے کا موقع دے دیں۔ آپ کو اس وقت کوئی سواری تک میسر نہ تھی۔ مکہ سے طائف تک کا سارا سفر آپ نے پیدل طے کیا۔ بعض روایات کی رُو سے آپ تنہا تشریف لے گئے تھے، اور بعض روایات کے مطابق آپ کے ساتھ صرف حضرت زید بن حارثہ تھے۔ وہاں پہنچ کر چند روز آپ نے قیام کیا اور ثقیف کے سرداروں اور معززین میں سے ایک ایک کے پاس جا کر بات کی۔ مگر انہوں نے نہ صرف یہ کہ آپ کی کوئی بات نہ مانی، بلکہ آپ کو صاف صاف نوٹس دے دیا کہ ان کے شہر سے نکل جائیں، کیونکہ ان کو اندیشہ ہو گیا تھا کہ کہیں آپ کی تبلیغ ان کے نوجوانوں کو "بگاڑ" نہ دے۔ مجبوراً آپ کو طائف چھوڑ دینا پڑا۔ جب آپ وہاں سے نکلنے لگے تو ثقیف کے سرداروں نے اپنے ہاں کے لفنگوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔ وہ راستے کے دونوں طرف دُور تک آپ پر آوازے کستے، گالیاں دیتے اور پتھر مارتے چلے گئے، یہاں تک کہ آپ زخموں سے چُور ہو گئے اور آپ کی جوتیاں خون سے بھر گئیں۔ اس حالت میں آپ طائف کے باہر ایک باغ کی دیوار کے سائے میں بیٹھ گئے اور اپنے رب سے عرض کیا:

"خداوندا، مَیں تیرے ہی حضور اپنی بے بسی و بے چارگی اور لوگوں کی نگاہ میں اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین، تو سارے ہی کمزوروں کا رب ہے اور میرا رب بھی تو ہی ہے۔ مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا کسی بیگانے کے حوالے جو مجھ سے درشتی کے ساتھ پیش آئے؟ یا کسی دشمن کے حوالے جو مجھ پر قابو پالے؟ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کسی مصیبت کی پروا نہیں، مگر تیری طرف سے عافیت مجھے نصیب ہو جائے تو اس میں میرے لیے زیادہ کشادگی ہے۔ مَیں پناہ مانگتا ہوں تیری ذات کے اُس نور کی جو اندھیرے میں اُجالا اور دنیا اور آخرت کے معاملات کو دُرست کرتا ہے، مجھے اس سے بچا لے کہ تیرا غضب مجھ پر نازل ہو یا